احمد جاوید

برصغیر میں کہانی کی قدیم روایت

یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ کہانی کی قدیم روایت کا آغاز مغربی پنجاب سے ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ''وڈ کہا'' (بڑھت کھتا) کو ہی کہانیوں کی پہلی کتاب کہا جا سکتا ہے۔ ہر چند کہ اس سے قبل بھی کہانی کہنے کی روایت موجود تھی مگر مصنف یا مصنفین کے ناموں پر تنازعے ہیں۔ ''وڈ کہا'' کی کہانیاں پشاچی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ یہ زبان تو اب مٹ چکی ہے مگر پنجابی کی بنیادوں میں اس کے اثرات کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ''وڈ کہا'' دو الفاظ کا مرکب ہے۔ یہ الفاظ اب بھی پنجابی میں مستعمل ہیں۔ ''وڈ'' کا مطلب بڑا یا بڑی ہوتا ہے جب کہ ''کہا'' سے مراد کہانی یا کہی ہوئی بات ہے، اس طرح وڈ کہا سے مراد بڑی یا عظیم کہانی ہے۔ احمد سلیم نے اپنے ایک مضمون میں اس کتاب کی قدامت کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

> ''رگ وید کے بعد جو اہم کتاب پنجاب میں تصنیف ہوئی وہ وڈ کہا کہلاتی ہے''

(پاکستانی ادب، کراچی۔ مارچ 1975ء)

''وڈ کہا'' کا مصنف گناڈھیہ ضلع جہلم کا رہنے والا تھا۔ اس نے خود کو اگرچہ راجہ نند (315 ق۔م) کا ہم عصر بتایا ہے مگر خیال ہے کہ وہ پہلی صدی عیسوی میں راجہ ست واہن کے دربار میں تھا۔ وہ ایک ناگ شہزادہ کرتی سین کا بیٹا تھا اور اس کی ماں ایک برہمن زادی تھی۔ گناڈھیہ نے اپنے دورِ حیات میں آٹھ لاکھ کے قریب دوہے لکھے مگر پھر کسی وجہ سے اس نے اپنے ہی ہاتھوں انہیں جلانا شروع کر دیا۔ محض ایک لاکھ دوہے بچ سکے۔ اسی بچے ہوئے حصے سے ہمیں ان کہانیوں سے آگاہی حاصل ہوئی ہے

Scanned by CamScanner

جنہیں بین الاقوامی ادب میں بھی شہرت حاصل ہے۔

یہ بات پورے طور پر واضح نہیں ہے کہ اس نے اپنی تخلیقات کو نذر آتش کرنے کی کوشش کیوں کی۔ گیان چند نے لکھا ہے:

''اپنی بے قدری کے صدمے سے وہ بیاباں چلا گیا
اور اپنے خونِ جگر کی تخلیق کو نذر آتش کرنے لگا۔ سات
حصے خاکستر کر چکا تھا کہ راجا آپہنچا اور اس نے ایک
حصہ بچالیا.....''

(اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند)

گیان چند نے ناقدری کے اسباب بیان نہیں کیے۔ گناڈھیہ کا عہد حکایات و امثال سے دلچسپی کا عہد تھا، علاوہ ازیں اسے دربار میں رسائی بھی حاصل تھی۔ پھر آخر اسے اور کس ناقدری کا سامنا تھا..... یقیناً وہ کوئی خصوصی حالات ہوں گے جنہوں نے اس کی ذہنی حالت کو متاثر کیا ہوگا۔

گناڈھیہ کی کہانیوں کی مقبولیت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ عہد اور ہر زبان میں اکٹھی کی جاتی رہی ہیں۔ سب سے پہلے 1040ء میں انہیں کشمیندر نے برہت کتھا منجری کے نام سے مرتب کیا اور اس میں ساڑھے سات ہزار دوہے شامل کیے۔ پھر یہ ترجمہ در ترجمہ کے عمل سے بھی گذریں، ایک مثال بدھ سوامی کا نیپالی نسخہ برہت کتھا اشلوک سنگرہ ہے۔ مگر یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ ان مصنفین نے ان کہانیوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا البتہ ان کے مطالعے کا دائرہ ضرور بڑھ گیا۔

گناڈھیہ کی کہانیوں کو اصل اہمیت اس وقت حاصل ہوئی جب وہ ''کتھا سرت ساگر'' کی شکل میں مرتب ہوئیں۔ یہی وہ مجموعہ ہے جس میں گناڈھیہ کی کہانیوں کا وہ آٹھواں باب شامل ہے جو جلنے سے بچ گیا تھا اور جس کے سبب سے ان کہانیوں کی رسائی مغربی ادب تک بھی ہوئی..... ''کتھا سرت ساگر'' کو پنڈت سوم دیو جین نے

Scanned by CamScanner

1063-88ء میں مرتب کیا تھا اور اس میں 22 ہزار کہانیاں شامل کی تھیں۔ اس طرح اس کتاب کے 124 ابواب ہیں۔

ڈی ڈی کوسمبی نے اپنی کتاب قدیم ہندوستان میں لکھا ہے کہ یہ کہانیاں سوم دیو نے تاجروں، دستکاروں اور اونچی ذات کے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے لکھی تھیں۔ یہ بات بھی قرین قیاس ہوسکتی ہے مگر کلیتاً درست نہیں۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ قدیم ہندوستان میں افسانوی ادب محض تفریح کی غرض سے تخلیق نہیں ہوتا تھا۔ کہانیوں کی مدد سے راجاؤں اور شہزادوں وغیرہ کی اصلاح و ہدایت کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ تعلیم بہت حد تک بڑے لوگوں ہی کا حق تھا جبکہ کوئی باقاعدہ نصابی تعلیم موجود نہیں تھی۔ یہی کہانیاں اور حکایات وغیرہ مددگار ثابت ہوتیں۔ یوں کہانیوں سے محض خوشی حاصل کرنے کا عمل ذرا بعد میں شروع ہوا۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ کہانی کی تکنیک میں دلچوئی کے سامان کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے تاکہ پڑھنے والا دلچسپی برقرار رکھ سکے تو وہ عنصر ان کہانیوں میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

سوم دیو کے زمانے میں کشمیر پر راجہ انت کی حکومت تھی۔ یہ سازشوں اور چالبازیوں کا زمانہ تھا۔ رانی سوریہ دتی اپنے دونوں بیٹوں کے بارے میں متفکر رہتی جو حکمرانی کے حصول کے لیے متصادم تھے۔ کتھا سرت ساگر رانی کی دلجوئی کے لیے لکھی جاتی رہی تاکہ اس کا دکھ کچھ کم ہو سکے۔ اس کے لیے ان کہانیوں میں یہ درس پوشیدہ تھا کہ دکھ کی حقیقت جان لینے سے ہی سکھ ملتا ہے اور یہ کہ دکھ کی حقیقت خیر اور شر کا ادراک بھی فراہم کرتی ہے۔

گناڈھیہ کی کہانیوں نے ''کتھا سرت ساگر'' کے ذریعے اردو ادب تک بھی رسائی حاصل کی۔ انیسویں صدی کے آغاز پر جب جان گلکرائسٹ نے فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام اردو زبان و ادب کی ترویج کا کام شروع کیا تو اسے ان کہانیوں کے ترجمے کی خواہش پیدا ہوئی۔ یہ کام مظہر علی ولا کے سپرد ہوا اور یوں 1813ء میں پچیس کہانیاں

Scanned by CamScanner

''بیتال پچیسی'' کے نام سے اردو میں ترجمہ ہوئیں۔ ترجمے کے اس کام میں للولال کوی نے مظہر علی ولا کی معاونت کی۔ ''بیتال پچیسی'' کی زبان ہندی آمیز ہے اس پر عربی اور فارسی کے اثرات دکھائی نہیں دیتے۔ یہ شاید اس لیے بھی ضروری تھا تا کہ ان کہانیوں کا مزاج برقرار رہے۔ ''بیتال پچیسی'' کے اسلوب کا سحر اس کی سادگی، روانی اور آہنگ میں ہے۔ دو ایک مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

''یہ احوال دیوان کا بیٹا سُن، اسے سوار کروا، گھر تو
لے آیا، پر راجہ کا بیٹا، برہ کی پیڑ سے بے کل تھا کہ لکھنا
پڑھنا، کھانا پینا، سونا، راج کاج، سب تج بیٹھا۔ نقشہ
اس کی صورت کا لکھ لکھ دیکھتا اور روتا.....''

''اس کا مکھ چندر ماتے بال گھٹا سے، آنکھیں مرگ کی
سی، ناک تیر کی سی، گلا کیوٹ کا سا، دانت انار کے
دانے، ہونٹوں کی لالی کندوری کی سی، کمر چیتے کی سی،
ہاتھ پاؤں کونپل کے سے، رنگ چنپے کا سا، غرض اس
کے جوبن کی جودت دن بہ دن بڑھتی تھی.....''

ان اقتباسات سے کہانی کہنے کے اس انداز کا پتہ چلتا ہے جو اس خطے میں صدیوں تک رائج رہا ہے۔ بیتال پچیسی کی کہانیوں میں حیرت کے ذریعے دانش پیدا کی گئی ہے۔ اس دانش کا بہت کچھ تعلق اس ماحول سے ہے جو اب ناپید ہو چکا ہے مگر حیرت اور تجسس تو ایسے عناصر ہیں جو ہر عہد کے قاری کو اپنا اسیر کر سکتے ہیں۔

''بیتال پچیسی'' میں اگرچہ پچیس (25) مختلف کہانیاں ہیں مگر ان کہانیوں کا محور دو ہی کردار ہیں۔ بیتال جو ایک لاش کی شکل پیڑ پر لٹکا ہے اور بکرم جو اسے جوگی کے پاس لے جانا چاہتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ہونے والے مکالمے میں ہی کہانی اپنا سفر مکمل کرتی ہے۔

Scanned by CamScanner

''بیتال پچیسی'' کے علاوہ گناڈھیہ کی کہانیاں انگریزی میں Ocean of Story کے نام سے بھی ترجمہ ہو چکی ہیں جبکہ انہی کہانیوں کے اثرات مختلف ذرائع سے فارسی، عربی اور فرانسیسی تک بھی پہنچے ہیں۔ چاسر نے بھی ان کا اثر قبول کیا ہے جبکہ لا فانٹین بھی اس سے محفوظ نہیں ہے۔

گناڈھیہ کی کہانیوں پر بنیادی طور سے ساتواہن عہد کے شہری اور قصباتی مذاق کی چھاپ نمایاں ہے۔ اس سے ان کہانیوں کے عہد کا تعین کیا جاسکتا ہے لیکن اس پر یہ اضافہ ضروری ہے کہ یہ کہانیاں صرف اپنے زمانے تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان کا سلسلہ گذشتہ میں مہابھارت اور رگ وید تک بھی جاتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ آج سے تقریباً چار ہزار سال پہلے یعنی اس وقت جب دراوڑی اور آریائی تہذیبوں کی آمیزش ہو رہی تھی، ان کہانیوں نے جنم لینا شروع کیا۔ اس طرح ان کہانیوں کا دائرہ اگر ایک طرف ماضی میں دور کہیں پیوست ہے تو دوسری طرف ان سے دلچسپی اگلے دو ہزار برسوں میں بھی برقرار دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایک اعتبار سے تہذیب کا بھی سفر ہے۔

کہانی کی قدیم روایت کا ایک بڑا ماخذ گناڈھیہ کی کہانیوں کو ہی تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ کہا گیا کہ کہانی کہنے کا سلسلہ قدیم ادوار سے کسی نہ کسی شکل میں چلا آرہا تھا، اس لیے ضروری ہے کہ آغاز سے ان سوتوں کا مطالعہ بھی کیا جائے جو کہانیوں کے وقوع پذیر ہونے کا باعث بنتے رہے۔

آریاؤں کی آمد کے ساتھ ہی تخلیقی ادب کے سوتے پھوٹنے شروع ہو گئے تھے۔ ہر چند کہ اس خطے میں ترقی یافتہ تہذیب تو آریاؤں سے قبل بھی موجود تھی۔ وادی سندھ میں موہنجوڈارو اور ہڑپہ اس کی مثالیں ہیں مگر ان شہروں کی کھدائی سے جو کچھ دریافت ہوا ہے اس سے یہ سراغ تو ضرور ملا ہے کہ یہاں کے قدیم باشندے فن تحریر سے آگاہ تھے مگر شعر و ادب کا سراغ ابھی تک نہیں ملا۔ اس اعتبار سے آریائی عہد کے ویدوں کو ہی ابتدا سمجھا جاسکتا ہے۔

Scanned by CamScanner

آریا جب ہندوستان میں آئے تو ان کے پاس بھجنوں کا ذخیرہ تھا۔ یہی بھجن رگ وید میں اکٹھے ہوئے ہیں۔ بھجن اگرچہ مذہبی نظموں کی شکل میں تھے مگر ان میں موجود بعض واقعات میں کہانی بننے کی صلاحیت بھی موجود تھی۔

آریاؤں کا پہلا پڑاؤ وادی سندھ میں ہوا۔ یہاں آ کر انھوں نے ٹیکسلا، چارسدہ اور پشاور جیسے شہر آباد کیے۔ سب سے بڑا مرکز ٹیکسلا تھا۔ قدیم ادبی روایات کا بہت کچھ تعلق اسی شہر سے ہے جو اب محض ایک چھوٹے سے قصبے کی شکل میں باقی رہ گیا ہے۔

ٹیکسلا میں بدھ زمانے کی جس یونیورسٹی کے آثار ملے ہیں اس نے مختلف زمانوں میں علم و ادب کی ترقی میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ مذہبی افکار و عقائد کی تدوین تو اس عہد کے باشندوں کی اپنی ایک بنیادی ضرورت تھی مگر فکری سیاسی اور ادبی ترقی کے بھی بہت سے کام سرانجام دیے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان و بیان کے اصول وضع کرنے سے لے کر ڈرامے کے فنی عناصر کی تشریح اور داستان طرازی تک ہر شعبے میں انقلابات رونما ہوئے۔ پانینی اور پتنجلی جیسے عالموں کا تعلق بھی اسی شہر اور اسی درسگاہ سے تھا۔ ٹیکسلا کی عہد در عہد ادب دوستی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ یہاں لوگ نہ صرف یہ کہ بدھ عہد ہی میں ہومر کے نام سے واقف تھے بلکہ ایلیڈ کو اپنی مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی کر چکے تھے۔ وادی سندھ اور بالخصوص ٹیکسلا میں ایسا انتظام تھا کہ یونانی ڈرامے کھیلے جاتے۔

ٹیکسلا کے قیام کی تاریخ کا تعین کرنا آسان نہیں اس ضمن میں مختلف روایتیں ہیں۔ ایک روایت ہندوؤں کی قدیم رزمیہ داستان رامائن میں درج ہے جس میں ٹیکسلا کو راجہ رامچندر کے بھائی بھرت کے ایک بیٹے ٹکسا کا دارالخلافہ بتایا گیا ہے۔ البتہ بعض ماہرین آثار قدیمہ نے اس کا قدیمی نام ''ٹکاشیلا'' بتایا ہے جو ایک قبیلے ٹکا کے نام سے موسوم تھا۔

ٹیکسلا کی جس اہمیت کی طرف اس وقت خصوصی طور پر اشارہ کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کی طویل ترین داستان مہابھارت یہیں تخلیق ہوئی۔ پانینی نے اس کا زمانہ چھٹی

Scanned by CamScanner

صدی قبل مسیح کا بتایا ہے۔ ابتدا میں یہ پچیس ہزار اشعار پر مشتمل تھی مگر بعد میں یہ تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ مہا بھارت میں بنیادی قصے کے گرد کہانیوں کا ایک طویل حصار بندھا ہوا ہے۔ اس طرح یہ رزمیہ داستان قصہ در قصہ چلتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہر عہد میں اس کے قصوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہے بلکہ ایک تحقیق کے مطابق یہ سلسلہ انیسویں صدی کے آغاز تک جاری رہا۔

مہا بھارت میں دو قبائل کوروؤں اور پانڈووں کی جنگ کا ذکر ہے جو پانی پت کے میدان میں لڑی گئی۔ ان قبائل کا تعلق ہستناپور سے تھا۔ ''دھنی ادب'' کے مصنف انور بیگ اعوان کا دعویٰ ہے کہ پانڈو قبیلے کا تعلق وادی سندھ سے تھا۔ بہر حال کہانی کی روایت کا ذکر کرتے ہوئے فی الوقت مہا بھارت کی افسانوی اہمیت کو واضح کرنا ہے۔ اس رزمیہ داستان میں موجود قصص نے بعد کے ہر دور کی کہانیوں کو مواد فراہم کیا یا ترغیب دی۔ پنچ تنتر ہتو پدیش، برہت کتھا اور جاتک کہانیوں تک میں اسی کتاب کے اثرات پہنچے ہیں۔ بلکہ پیشتر سنسکرت اور ہندی ڈرامے نے بھی مہا بھارت ہی سے کہانیاں یا بنیادی خیال لیے۔ کالی داس جس کے ڈراموں خصوصاً شکنتلا نے دنیا بھر کے ادب کو متاثر کیا، مہا بھارت ہی سے اخذ شدہ ہے۔ کالی داس نے شکنتلا کا کردار اسی رزمیہ داستان سے حاصل کیا تھا۔

آریاؤں کا ابتدائی عہد رگ وید سے شروع ہو کر مہا بھارت پہ ختم ہو جاتا ہے۔ اسی دور میں بدھ کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہوتے ہیں جو آگے راسخ ہوتے چلے جاتے ہیں پھر مختلف دیگر تہذیبیں بھی اس کا حصہ بنتی چلی جاتی ہیں جن میں ایرانی اور یونانی تہذیبیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس کے باوجود کہ ہندوستان میں مختلف تہذیبوں کا سنگم ہوا ہے اور ان کے اثرات بھی مختلف علوم و افکار پر ثبت ہوئے ہیں مگر کہانی کا سفر جن خطوط پر آغاز ہوا تھا۔ مسلمانوں کے یہاں قدم جمانے تک بالعموم اسی طرح چلتا دکھائی دیتا ہے۔

مہا بھارت میں مختلف قصوں کا ظہور نصیحتوں کی صورت میں ہوا ہے۔ یہی سلسلہ

Scanned by CamScanner

ہمیں آگے بھی دکھائی دیتا ہے البتہ کہانی کی دلچسپی کو جن عناصر کی ضرورت ہوتی ہے اس میں ہر عہد میں اضافہ بھی ہوتا رہا۔ قدیم کہانی کی تکنیک یہ تھی کہ پہلے کوئی سوال جنم لیتا، اس کی وضاحت میں کہانی بیان ہوتی جس کے نتیجے میں کوئی درس پوشیدہ ہوتا۔

قدیم کہانیوں میں ''جاتک کہانیاں'' بھی اصلاحی مقصد سے مرتب ہوئیں۔ یہ کہانیاں گوتم بدھ کے فرمودات پر مبنی ہیں اور بجا طور پر حیوانی کہانیوں کا سب سے بڑا مخزن ہیں۔ بدھ کا کہنا تھا کہ آدمی کی مثال بھی بچے کی ہے وہ بھی کہانی سننا چاہتا ہے۔ جاتک کا مطلب جنم ہوتا ہے۔ ان کہانیوں میں گوتم بدھ کے مختلف جنموں کا ذکر ہے جب وہ مختلف جانوروں کی شکل میں تھا۔ جانوروں کے روپ میں وہ جن تجربات سے گذرا ان کہانیوں میں ان کا ذکر ہے۔ ان کی مدد سے گوتم بدھ کی تعلیمات کی تبلیغ بنیادی مقصد تھا۔ ان کہانیوں کا زمانہ چوتھی صدی قبل مسیح ہے۔ گوتم بدھ کے فرمودات پر مبنی بعض دوسری کہانیوں کا تذکرہ بھی تاریخ میں مل جاتا ہے مگر وہ زیادہ اہم نہیں ہے۔

تاریخ ادب میں جن کہانیوں نے سب سے زیادہ شہرت پائی وہ پنچتنتر کی کہانیاں ہیں۔ پنچتنتر سے مراد پانچ علوم ہے یہ کہانیاں بھی ان شہزادوں کی اخلاقی اصلاح کے لیے لکھی گئیں جنہیں امور مملکت سے وابستہ ہونا ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر ''ارتھ شاستر'' کے اثرات بہت واضح ہیں۔

موریہ عہد میں چانکیہ کی تصنیف ارتھ شاستر کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں حکومت کرنے کے گر بتائے گئے ہیں کہا جاتا ہے کہ یہی وہ کتاب ہے جس نے نہ صرف چندر گپت موریہ کی حکومت کو مستحکم ہونے میں مدد دی بلکہ آنے والے ہر حکمران کے لیے ہدایت نامہ ثابت ہوئی۔ پنچتنتر میں نہ صرف یہ کہ چانکیہ کا ذکر موجود ہے بلکہ اس کے راوی وشنوشرما کو بھی محققین نے چانکیہ ہی قرار دیا ہے۔ دیگر قدیم ہندوستانی کہانیوں کی طرح اس کتاب کا رخ بھی عقل و دانش کی طرف ہے کہ اس کے بغیر آدمی کی طاقت برقرار نہیں رہتی۔

برصغیر میں کہانی کی تخلیق کا سبب کوئی قول یا کہاوت ہوتی تھی۔ یا پھر یہ کہانیاں

Scanned by CamScanner

اقوال اور کہاوتوں کو جنم دیتی تھیں۔ اقوال اور کہاوتیں انسانی تجربات کا نچوڑ ہوتی ہیں اور آئندہ کے لیے ہدایت کا کام دیتی ہیں۔ پنچتنتر میں بھی ایسے اقوال دستیاب ہوتے ہیں جن سے ان کہانیوں میں چھپی دانش کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پنچتنتر کے چند اقوال دیکھیے:

''بناڈر کے یا لالچ کے یا کسی خاص غرض کے انسان نہ کسی کے ساتھ خلق سے پیش آتا ہے نہ کسی کی آؤ بھگت کرتا ہے''۔

''آگ جو جنگل کو جلا دیتی ہے، ہوا اس کا ساتھ دیتی ہے اور چراغ کو گل کر دیتی ہے۔ کمزور کا کون دوست؟''۔

''دانائی اور بادشاہی کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ بادشاہ کی عزت اپنے ملک میں ہی ہوتی ہے جبکہ دانا کی ہر جگہ''۔

''افلاس کی سب سے بڑی قسم وہ ہے جس میں علم کا قحط ہو.....''۔

''تیر کا زخم بھر سکتا ہے مگر زبان کی تلوار کا گھاؤ کبھی مندمل نہیں ہوتا''۔

دانش و دانائی پنچتنتر کی کہانیوں کی اساس ہے اسی لیے اس کے اسلوب اور تکنیک میں ایک ایسا طریقہ کار ہے جو اس دانائی کو ابھارتا ہے جس کی ترسیل ان کہانیوں کا بنیادی مقصد ہے۔ یہاں مثال کے لیے ایک کہانی ملاحظہ کی جا سکتی ہے جو ترجمہ کر کے کلیلہ و دمنہ میں شامل کی گئی۔ یہ ایک بلے اور چوہے کی کہانی ہے۔ کہانی کے آغاز پر بادشاہ برہمن سے سوال کرتا ہے کہ اگر آدمی بہت سے دشمنوں میں گھر جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے۔ جواب میں برہمن اسے یہ کہانی سناتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک بلا کسی شکاری کے جال میں پھنس گیا۔ چوہا جب کھانے کی تلاش میں ادھر آیا تو بلے کو قید میں دیکھ بہت خوش ہوا مگر اسی دوران میں اس نے دیکھا کہ ایک نیولا خود اس کی تاک میں ہے۔ جب کہ درخت پر

Scanned by CamScanner

بیٹھا ایک الو بھی اس پر جھپٹنا چاہتا ہے پس اس موقع پر اس نے عقل کو استعمال کیا۔ بلے سے جان کی امان مانگ کر اس کی رسیاں کاٹنے لگا۔ جب نیولے اور الو نے بلے کو آزاد ہوتے دیکھا تو وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اس طرح چوہے کی جان بچ گئی۔ اس کہانی کی رمز واضح ہے مگر اصل خصوصیت وہ اقوال ہیں جو جا بجا آتے ہیں۔ چند جملے دیکھیے:

''عام طور پر دوستی اور دشمنی قائم نہیں رہتی اور وہ حوادث زمانہ کے باعث بدلتی رہتی ہے''۔

''مضبوط ارادے والا شخص کسی حال میں بھی خوف زدہ نہیں ہوتا''۔

''ہر کام کی کوئی نہ کوئی تدبیر ہوتی ہے''۔

''بدقسمت سمجھو اس شخص کو جس کے دوست تھوڑے ہوں اور اس سے بھی زیادہ بدقسمت اس شخص کو سمجھو جو دوست بنا کے چھوڑ دیتا ہے''۔

عالمی ادب میں پنچتنتر کی کہانیوں کو مثالی مقبولیت حاصل ہے۔ یہ کتاب چھٹی صدی میں نوشیرواں کے وزیر بروزیہ کے ذریعے ایران پہنچی اور پہلوی زبان میں ترجمہ ہوئی۔ اس کے فارسی مترجم کا نام نظام الملک ابو المعالی نصر اللہ بن محمد بن عبدالحمید ہے۔ تقریباً سو برس بعد المنصور نے اسے عبداللہ ابن المقنع سے عربی میں ترجمہ کرایا پھر یہ ترکی میں منتقل ہوئی۔

عربی کے توسط سے ''کلیلہ ودمنہ'' دنیا بھر کے ادب کا حصہ بن گئی۔ گیارہویں صدی میں یہ یونانی زبان میں ترجمہ ہوئی۔ تیرھویں صدی میں عبرانی اور ہسپانوی میں..... اور پھر لاطینی میں..... یوں ہر زبان میں ترجمہ کیے جانے کے باعث یہ نہ صرف مسلمانوں کے افسانوی ادب تک رسائی حاصل کر گئی بلکہ ازمنہ متوسط کے یورپی لٹریچر کا بھی حصہ بنی۔

Scanned by CamScanner

حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی کہانیوں اور کہاوتوں کا بڑا حصہ انہی کہانیوں پر مشتمل ہے۔

الف لیلیٰ جو عربوں کے افسانوی ادب کا شاہکار ہے اس میں بھی یہ کہانیاں داخل ہوئی ہیں مگر اس عظیم کتاب میں یہ اس طرح گھل مل گئی ہیں کہ ان کی اپنی شناخت چھپ سی گئی ہے۔ الف لیلیٰ کی ان کہانیوں کے پس منظر میں ہندوستان کہیں دکھائی نہیں دیتا بلکہ بغداد اور بصرہ کی اس تہذیب کا غلبہ ہے جو تمول اور عیش پسندی میں اپنی مثال آپ تھی۔

ہندوستان میں کہانی کی روایت کا آغاز ایک واضح مقصد سے ہوا مگر پھر رفتہ رفتہ اپنی بنت اور اسلوب میں تخلیقی اور تخیلاتی عناصر سے لبریز ہوتا چلا گیا۔ کہانیوں کی تخلیق کا مقصد اصلاح اور تربیت بھی رہا تھا مگر ان کہانیوں نے اپنے سفر میں تفریح کے بھی اتنے عناصر اپنے اندر سمو لیے کہ ہر عہد اور ہر زبان نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔

ان کہانیوں میں اگرچہ ایک خاص مذہبی منظر نامہ بھی موجود دکھائی دیتا ہے اور ایسے افکار بھی ہیں جو ایک مخصوص عہد کی ترجمانی کرتے ہیں مگر مجموعی طور پر یہ اس اجتماعی ذہن کی پیداوار ہیں جو یہاں کی تہذیب و تمدن سے جلا حاصل کرتا رہا۔ اس طرح ان کہانیوں میں صدیوں کے تجربات کا نچوڑ بھی ہے اور حکمت و دانائی کے جواہر بھی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد قدیم حکایات و کہانیوں سے ادبی و فنی سطح پر یا تو دلچسپی کم ہوتی چلی گئی اور یا پھر ان کا پس منظر بدلتا گیا۔ مسلمانوں کی دلچسپی زیادہ تر فارسی ادب سے قائم ہوئی یا پھر قدیم کہانیوں نے وہ شکل اختیار کی جو مسلم ذہن اور تہذیب کے قریب تر تھی۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعد کے زمانوں میں بھی اردو ادب میں یہ کوئی مستقل روایت نہیں بن سکیں۔ جدید افسانوی ادب میں کہیں کہیں ان کی کچھ جھلک ضرور دکھائی دے جاتی ہے۔ انتظار حسین نے بالخصوص ان سے فیض حاصل کیا ہے۔ بعض دیگر افسانہ نگاروں کا حوالہ بھی دیا جا سکتا ہے جن کے ہاں اگرچہ ان کہانیوں کا متن یا اسلوب نہیں پہنچا مگر اساطیر نے اپنے معانی میں رسائی ضرور

Scanned by CamScanner

حاصل کی ہے۔ البتہ یہ کہانیاں کسی نہ کسی لوک شکل میں اب بھی بڑی بوڑھیاں اپنی اگلی نسلوں کو منتقل کرتی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ اس کے تناظر سے ہرگز آگاہ نہیں۔

کتابیات

۱۔ تمدن ہند، گستاء لی بان

۲۔ قدیم ہندوستان، ڈی ڈی کوسمبی

۳۔ نثری داستانیں، ڈاکٹر گیان چند جین

۴۔ روایات تمدن قدیم، عباس علی جلالپوری

۵۔ تہذیب کا ارتقا، سبط حسن وغیرہ

Scanned by CamScanner